احساس کے زخم

پرہلاد رائے دانش

دوسری شعوی پیشکش

احساس کے زخم

پرہلاد رائے دانشؔ

کے سوتے جگا گیا۔ان کی شاعری کی بنیاد یہی غم ہے جواُن کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے:

زندگی ہم پہ جبر ہے دانش جانے ہم کس کے اختیار میں ہیں

وہی اضطراب نفس نفس وہی انتشار نظر نظر
ترے بعد دانشِ زار کو نہ قرار ہے نہ قیام ہے

قدموں کے تلے دُھوپ حیاتِ گزراں کی
آنکھوں میں کسی لمحۂ شاداب کا سایہ

کیا یہ اشعار میرے اس خیال کی تائید نہیں کرتے جس کا اظہار میں نے سطورِ بالا میں کیا تھا۔
دانش کے فکروفن کے جوہر ان کی غزلوں میں ہی کھُلے ہیں۔منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اُنھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں، مگر اکثر نظمیں ہیئت کے اعتبار سے نہ سہی، تاثر اور موضوعِ سخن کے اعتبار سے ان کی غزلوں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ان کی نظموں کی، میں ان کی ایک نظم کے حوالے سے تفہیم کی کوشش کرتا ہوں:

پرانی داستاں پھر اِک نئے عنواں سے دہرائیں
چلو اِک بار پھر اس کوچۂ رنگیں میں ہو آئیں

(شام کا جادو)

مجموعۂ کلام کے آخر میں کچھ قطعات اور رُباعیات اس امر کی گواہ ہیں کہ شاعر نے ان اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ملاحظہ کیجیے کہ قطعہ ان کی تخلیقیت پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے:

اپنی پروردۂ سکوت صدا سرمدی زمزمے سناتی ہے
جب میں خلوت میں گنگناتا ہوں بزمِ آفاق جھوم جاتی ہے

پر ہلا درائے دانش کی شاعری اُن کے جذبات واحساسات کی شاعری ہے۔اور یہی شاعری دیرپا ہوتی ہے۔ایک ہلکی سی کسک، ایک میٹھی میٹھی سی چبھن اور ایک بے نام شے کی تلاش:

کس چیز کی جستجو ہے دانش
ہر شے پہ نگاہ کر رہا ہوں

مجھے یقین ہے کہ دانش کا مجموعۂ کلام اربابِ نقد ونظر کی محفل میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

—— رفعت سروش

❖○❖

پھیلتے جاتے ہیں یہ دُھند کے بادل کیسے
بڑھتی آتی ہے یہ گھنگھور گھٹا سی کیسی
ذہن، کس سوچ، کس اندیشۂ غم میں گُم ہے
دِل پہ چھائی ہے یہ گمبھیر اُداسی کیسی

❖○❖

دے مسرّت کا بھی کوئی عنواں
زیست کے دُکھ بھرے فسانے کو
دل کو پابندِ غم نہ کر اتنا
لب ترس جائیں مسکرانے کو

❖○❖

وقت کی چیرہ دستیوں کے خلاف
سر اُٹھانا بہت ضروری ہے
غم کی غارت گری پہ گاہ بہ گاہ
مسکرانا بہت ضروری ہے

ابر کے پیچھے دُھندلی دُھندلی سی
طلعتِ ماہتاب ہو جیسے
صبح دَم، عشرتِ شبانہ کا دھیان
ایک گم گشتہ خواب ہو جیسے

ساتھ لے چل ہمیں بھی شورِ جرس
نوحہ گر، رفتگاں کے ہم بھی ہیں
تھیں ہمیں بھی کچھ اس سے اُمّیدیں
شکوہ سنج اس جہاں کے ہم بھی ہیں

نہ چلی رسمِ خیر اندیشی
شر پسندی یہاں کی ریت ہوئی
مان لی اپنی ہار یزداں نے
آخرش اہرمن کی جیت ہوئی

❖○❖

جو کچھ سلوک اس کا رہا بھول جائیں ہم
جی چاہتا ہے ربط پھر اس سے بڑھائیں ہم
دن، جو گزر چکے ہیں پھر اک بار لوٹ آئیں
راتیں جو کھو گئی ہیں انھیں ڈھونڈ لائیں ہم

❖○❖

ملے گا کوئی حسیں ہمسفر کبھی نہ کبھی
کھلیں گے پھول سرِ رہگذر کبھی نہ کبھی
چلا گیا ہے جو موسم اُداس کر کے ہمیں
وہ لوٹ آئے گا شاید اِدھر کبھی نہ کبھی

❖○❖

کیا عجب یاد ہم آجائیں اُسے
آئینہ دیکھ رہا ہے کوئی
تُو کہاں ہے دلِ از خود رفتہ
آ تجھے ڈھونڈ رہا ہے کوئی

ہلاکِ تلخیِ بیگانگی نہیں ہیں ہم
حلاوتِ نگہہِ آشنا نے مارا ہے
جو کشتگانِ جفا ہیں، وفا طلب ہوں گے
وہ کیا کریں جنھیں تیری وفا نے مارا ہے

❖○❖

خود فراموشیوں کے افسوں کی
ساعتِ برہمی سے ڈرتا ہوں
بہرہ اندوزِ غفلتِ غم ہوں
کربِ خود آگہی سے ڈرتا ہوں

❖○❖

تراشے ہیں سکوں کے سو بہانے
دلِ بے تاب کو سمجھا لیا ہے
تری خلوت میسّر جب نہ آئی
تو ہر محفل میں جی بہلا لیا ہے

❖○❖

رُباعیات

رُتبے میں کوئی جس کا نہ ہم پایہ ہے
کس قعرِ مذلّت میں وہ آ پہنچا ہے
اپنی انسانیت پہ شک گزرا ہے
انساں کو جب انساں کا خدا دیکھا ہے

جھڑکیں گے تو بے خطا بھی نادم ہو گا
ہر چھوٹے بڑے کا یہی خادم ہو گا
سہما ہوا بیٹھا ہے جو دہلیز کے ساتھ
اِس اونچے گھرانے کا ملازم ہو گا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

منہ ،غیر کا، بے حسی سے تکتا کیوں ہے
طاری ترے اعصاب پہ سکتہ کیوں ہے
جو تیرا ہے لیکن جو تجھے مل نہ سکا
خود بڑھ کے جھپٹ لے اب،جھجکتا کیوں ہے

بند آنکھوں کو سیکھ تو سہی وا کرنا
اِمروز سے اندازۂ فردا کرنا
قسمت کی لکیریں تو ترے ہاتھ میں ہیں
بے مہریِ قسمت کا گلہ کیا کرنا

منہ وقت کا بے بسی سے تکتے رہنا
درماندہ امیدوں کا بلکتے رہنا
اے دل! تجھے بددُعا یہ کس نے دی ہے
جینے کی ہوس میں یوں سسکتے رہنا

نقشِ نظر انداز ہوا جاتا ہوں
گم گشتہ کوئی راز ہوا جاتا ہوں
اب پاس سے میں خود کو نہیں سن سکتا
اب دُور کی آواز ہوا جاتا ہوں

دِل اور دُنیا کا قصّہ گو: پر ہلا درائے دانش

جناب پر ہلا درائے دانش سے مرحومہ ممتاز میرزا صاحبہ نے مجھے متعارف کرایا تھا، پھر یہ تعارف دھیرے دھیرے دوستانہ تعلق میں بدل گیا۔ دانش صاحب مصروف آدمی ہیں، ان سے ملاقات کے موقعے کم ہی میسّر آتے ہیں لیکن دہلی جیسے بے مروّت شہر میں ایک بامروّت دوست کی موجودگی کا تصوّر بھی بڑی چیز ہے۔ پھر ہفتوں بعد ملیں یا مہینوں میں، ان کے برتاؤ میں خلوص کی وہی تازگی اور لگاؤ کا وہی بے محابا پن ہوتا ہے جس کا تجربہ اُن سے پہلی بار مل کر ہوا تھا۔

دانش صاحب کثیر الاشغال ہیں۔ وکالت کی پیشہ ورانہ مصروفیت کے علاوہ دوسرے کئی کاموں میں بھی وہ خود کو اُلجھائے رکھتے ہیں لیکن اپنی ان تمام مصروفیتوں کے باوجود، جو زیادہ تر غیر شاعرانہ نوعیت کی ہیں، وہ شعر گوئی کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ رسماً شعر نہیں کہتے بلکہ کوئی اندرونی لگن ہے جو اُن سے شعر کہلواتی ہے۔ اس کی مزید توثیق ان کا کلام پڑھ کر ہو جاتی ہے جو رسمی اور روایتی مضامین کی تکرار سے پاک اور شاعر کے اپنے مشاہدات اور محسوسات کا ترجمان ہے۔

دانش صاحب چونکہ ایک عملی انسان ہیں اس لیے ان کے مشاہدات اور محسوسات کا دائرہ خاصا وسیع ہے اور اس دائرے میں ہم عصر زندگی کے وہ سب مظاہر سمٹ آئے ہیں جن سے اپنی اپنی جگہ ہم سبھی دوچار ہیں۔ وہ تاریخی عوامل جو ایک استحکام یافتہ تہذیبی اور فکری نظام کے مکمّل انتشار اور صدیوں پرانے سماجی رشتوں اور انسانی روابط کی مکمّل بربادی پر منتج ہوئے، زمین کے دوسرے حصّوں پر بہت پہلے رونما ہو چکے تھے۔ خود ہمارے یہاں بھی ان کی پرچھائیاں گزشتہ صدی کے آغاز یا اس سے بھی کچھ پہلے ہی نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن ابھی ہماری زندگی ان انسانی قدروں سے پوری طرح بیگانہ نہیں ہوئی تھی جن کے پیچھے ہمارا صدیوں کا تجربہ تھا اور ہمارا طرزِ عمل جن کا تابع رہا تھا۔ تقسیمِ ملک کے حادثے اور اس کے پیدا کردہ ماحول نے جو ایک ہنگامہ پرور ماحول تھا، تہذیب کی اس بساط کو اُلٹ دیا جس نے ان قدروں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا تھا۔

آزادی کے بعد ملکی معیشت کو ایک نئی سمت دینے کی غرض سے صنعتی سماج کے قیام کی طرف تیزی سے پیش قدمی کا جو فیصلہ ہمارے سیاسی آقاؤں نے کیا، معاشی ترقی کے لیے شاید ضروری تھا

❖○❖

پردہ وہ مرے دل پہ گرادے کوئی
نظروں سے مری مجھ کو چھپادے کوئی
جو کچھ ہوں میں اب، وہ مجھے منظور نہیں
کچھ اور مجھے آکے بنادے کوئی

❖○❖

دھڑکن میں تجھے دل کی بسالایا ہوں
آنکھوں میں کئی خواب سجالایا ہوں
کیا تجھ کو خبر، میں اپنی خلوت کے لیے
کیا کچھ تری محفل سے چرالایا ہوں

❖○❖

❖○❖

پھولوں کی ہنسی، گریۂ شبنم تم ہو
میرے لیے مفہومِ دوعالم تم ہو
میں اس لیے کرتا ہوں محبّت تم سے
تم اور کوئی نہیں ہو، جانم تم ہو

❖○❖

شیرازۂ احساس ہے برہم اپنا
یعنی خوشی اپنی ہے نہ اب غم اپنا
کیونکر کہیں جی رہے ہیں کس عالم میں
مدّت سے نہیں ہے کوئی عالم اپنا

❖○❖

جو اس کی خوشی وہی خوشی ہے اپنی
منسوب اسی سے زندگی ہے اپنی
ہم نے اسے سمجھا ہے کب اپنا دشمن
غم سے تو پرانی دوستی ہے اپنی

افسوس ہے کوئی نہ پشیمانی ہے
ہر لمحہ خود اپنے پہ ستم رانی ہے
انجام ہمارا، اب نہ جانے کیا ہو!
اب جی میں نہ جانے ہم نے کیا ٹھانی ہے

تمکینِ غم کی یہ تباہی، توبہ
بڑھتی ہوئی آشفتہ نگاہی، توبہ
طوفانِ حوادث میں سفینہ دل کا
اس طرح گھرا ہے کہ الٰہی توبہ

مستی کی نظر کس سے سہی جاتی ہے
جو شے بھی ہے گم ہو کے رہی جاتی ہے
اُٹھتی ہیں جو دل سے سرخوشی کی لہریں
دُنیا انھی لہروں پہ بہی جاتی ہے

❖○❖

ہر جنبشِ چشمِ ملتفت، اِک اقرار
اے دل! تجھے اب تک بھی ہے وہم انکار
اک بار اُسے دیکھا تھا جھجک کر میں نے
اس نے مجھے مسکرا کے دیکھا کئی بار

❖○❖

اے اہلِ زمیں ایک وہ وقت آئے گا
جب قہر یہ آسمان برسائے گا
میدان میں پرچم نہ کھُلے گا کوئی
آنگن میں نہ آنچل کہیں لہرائے گا

❖○❖

احساس کے زخم

پرہلاد رائے دانش

لیکن اس کے کچھ منفی مضمرات بھی تھے۔ دیہات اور چھوٹے قصبات جو ایک حد تک اب بھی امن و سکون کا گہوارہ تھے اور جن کی فضا دھرتی کی میٹھی مانوس سگندھ سے اب بھی سرشار تھی، نئی نسلوں کے لیے اپنی کشش کھونے لگے۔ شہروں کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور نتیجتاً شہروں کی آبادی اس انداز سے بڑھنے لگی کہ شہر کے روایتی مفہوم کا اطلاق ان پر ممکن نہیں رہا۔ شہر موجود، شہری بھی موجود لیکن شہریت کا احساس مفقود۔ اجنبی لوگ، بھانت بھانت کے لوگ، دُور دُور کے لوگ، ایک دوسرے کی عادتوں سے ناواقف، طور طریقوں سے ناآشنا، طبیعتیں مختلف، صورتیں مختلف مگر سب ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے بے تعلق رہنے پر بھی مجبور۔ بے بسی، گھٹن اور مہملیت کا احساس تحمل کی حدوں سے گزر جائے تو مظاہرے، تشدّد، پولیس لاٹھی چارج، گولیاں اور کشت و خون۔ دانش صاحب کے کلام میں اس عصری صورتِ حال کی جھلکیاں قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی ہیں:

جھونکے بھی ہواؤں کے خنجر بہ کف آتے ہیں — اس شہرِ ستمگر میں کیا سانس لیا جائے

کیا نظمِ گلستاں ہے — ہر پھول پریشاں ہے

دُکھ بانٹنے آئے گا ہر پوچھنے والا کیا؟ — کس کس کو بتائیں ہم کیا ہم پہ گزرتی ہے

بھری پری اِک دُنیا ہے — کوئی پھر بھی تنہا ہے

کیا کریں سیرِ کائنات، کہ لوگ — اپنی ہی ذات کے حصار میں ہیں

صنعتی نظام کی لعنتیں ہماری روزمرّہ زندگی میں دخیل ہوگئی ہیں لیکن اس کی کم سے کم برکتوں سے بھی ہماری آبادی کا بڑا حصّہ محروم ہے۔ ریاکارانہ سیاست اس محرومی پر طرح طرح کے خوشنما نعروں کے پردے ڈالنے کی کوشش کرتی ہے جس کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تحریکِ آزادی کے دِنوں میں سیاسی رہنماؤں کے اخلاص اور ایثار کا جو نقش قائم ہوا تھا اور جس نے دِلوں میں حوصلہ مندی کی ایک لہر دوڑا دی تھی، دُھندلاتے دُھندلاتے معدوم ہوگیا ہے اور حوصلہ مندی کی جگہ بے حوصلگی اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔ دانش صاحب نے اس تلخ سچائی کا اظہار اپنے بہت سے اشعار اور بعض نظموں میں بھی کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس شہرِ سیاست میں — ہر چیز سیاسی ہے

ہے کدورت دلوں پہ چھائی ہوئی — آئنے پردۂ غبار میں ہیں

کب کہاں آگ لگی ہو جانے ہر طرف اب بھی دُھواں ہے کتنا

بہار آئی چمن میں اس احتیاط کے ساتھ چمن کے پھول ترستے رہیں نمو کے لیے

مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال نے وقت کی رفتار بڑھادی ہے۔ زندگی اب قدم بہ قدم اپنا سفر طے نہیں کرتی، تیزی سے گردش کرتے ہوئے پہیوں کے ساتھ دوڑتی رہتی ہے یا فولادی پَر لگا کر ہوا میں اُڑتی ہے۔ زمان و مکاں کے فاصلے سمٹ کر قریب آ گئے ہیں لیکن اپنے قدرتی گہوارے سے انسان دُور، بہت دُور ہو گیا ہے۔ فطرت کی مہربان آغوش میں رہ کر داخلی توانائی کے حصول کے جو مواقع اسے میسّر تھے اُن سے وہ بڑی حد تک محروم ہو گیا ہے: ندیاں اور پہاڑ، لہلہاتے کھیت اور سبزہ زار، مویشیوں کے ریوڑ اور پرندوں کے غول یہ سب ایسے خارجی منظر تھے جن کا عکس وہ اپنے باطن میں دیکھ کر تازہ دَم ہو جاتا تھا۔ اب یہ منظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ اب اس کے دائیں بائیں دیو ہیکل عمارتیں ہیں، دُھواں اُگلتی چمنیاں ہیں، شور کرتی مشینیں ہیں اور سامنے ایک لمبی سیاہ سڑک جو حدِ نظر تک دوڑتی چلی گئی ہے، کسی نامعلوم منزل کی طرف، اس بے بسی کی ایک کیفیت ملاحظہ ہو:

اجل کی راہ سے کترا کے ہم کدھر جائیں کہ زندگی نے اسی راستے پہ ڈالا ہے

اور یہ بھی:

جیسے کسی خلا میں کہیں جی رہے ہیں لوگ دانش زمیں ہے اب نہ کوئی آسمان ہے

وقت یوں تو سدا ہی سے انسانی خواہشوں، اُمنگوں اور خوابوں کو روندتا، کچلتا آگے بڑھتا رہا ہے۔ تاریخ کا دھارا اپنی سمتِ سفر کا تعیّن خود ہی کرتا رہا ہے۔ یہ تصوّر کہ انسان اس کا رُخ موڑ دینے پر قادر ہے محض ایک آرزو کا اظہار ہے لیکن ہمارے عہد میں تو وقت کا ریلا اور بھی پُرزور و دُشوار ہو گیا ہے اور ہر اُس چیز کو، جو اس کی راہ میں ذرا بھی مزاحم ہو اور کسی محفوظ گوشے میں پل دو پل کو قدم جمانے کی نیت رکھتی ہو، خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔ قرار و قیام کی ساری صورتیں ناپید ہو گئی ہیں۔ وقت کی یہ چیرہ دستیاں دانش صاحب کو بھی پریشان کرتی رہی ہیں:

وقت کے ساتھ بہے جاتے ہیں ہم تیز یہ سیلِ رواں ہے کتنا

دم توڑتے لمحوں سے اُلجھتی ہوئی سانسیں چاہا تو بہت کچھ تھا مگر ہم کو ملا کیا؟

باہر کچھ نہیں ہے اور ہے تو بدہیئت اور ڈراؤنا۔ باہر کے انعکاس نے انسان کے داخلی وجود کو بھی ویرانے میں تبدیل کر دیا ہے، مگر یہاں ابھی بھی کچھ ایسی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آ جاتی ہیں جن کا تعاقب کرتے ہوئے زندگی کی لاحاصلی کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔ یہ اُن خوشگوار یادوں

کی پرچھائیاں ہیں جو نیم جاں ہو کر بھی ابھی زندہ ہیں، یہ اُن حسین خوابوں کے ہیولے ہیں جنھیں دیکھتے رہنا اُس کی آنکھوں کی مجبوری اور اس کے دل کی دھڑکنوں کا تقاضا ہے۔ یہ وہ خوبصورت اور دلنواز پرچھائیاں ہیں جو اُس کی یادوں اور اُس کے خوابوں میں رنگ بھرتی رہی ہیں۔ کھو جانے والی رفاقتوں کی یادیں اور نئے رشتوں کے خواب — وہ رفاقتیں اور رشتے جو شاعر کا نجی سرمایہ ہیں اور کسی محبوب شخصیت کی دین، ایسی دین جو لازوال ہے:

چھوڑ کر ہم نے تو رستے سارے — چن لیا پیار کا رستا جاناں
تو ملے ہم سے تو بتلائیں تجھے — ہم کو ارمان ہیں کیا کیا جاناں
خواب بننے لگیں آنکھیں کیا کیا — ہم نے جب جب تجھے دیکھا جاناں

دانش صاحب کی شعر گوئی کا اصل محرک ان کا یہی ذہنی یا جذباتی رویّہ ہے جسے ہم حسن پرستی یا عشق پیشگی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان کے بیشتر اشعار حسن و عشق کے باہمی معاملات اور ان معاملات سے جنم لینے والی گوناگوں کیفیات کے ترجمان نظر آتے ہیں اور یہ ترجمانی اثر آفریں بھی ہے اور کیف انگیز بھی۔

دانش صاحب کو شاعری کی کئی اصناف سے شغف ہے۔ انھوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رُباعیاں بھی لکھی ہیں اور قطعے بھی اور ہر صنف میں اپنے جذبات و محسوسات کا فنکارانہ اظہار کرنے میں وہ کامیاب ہیں لیکن غزلیں انھوں نے زیادہ تعداد میں کہی ہیں جو اُردو شاعری کی اس سدا بہار صنف سے ان کی مستقل وابستگی اور پائدار فریفتگی کا اظہار ہے؛ اسی لیے میں نے اپنی گفتگو میں حوالے ان کی غزلوں ہی سے دیے ہیں لیکن ان کی مکمل شاعرانہ شخصیت سے جان پہچان کے لیے ان کی نظموں، رُباعیوں اور قطعوں کا مطالعہ بھی ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ دانش صاحب کے پہلے مجموعے کی طرح اُن کے اس دوسرے مجموعے کی بھی، شاعری کے قدر شناسوں میں بھرپور پذیرائی ہوگی۔

— مخمور سعیدی

اپنی بات

کل تک جو طلسم تھا یا معجزہ، وہ آج حقیقت ہے، سب کے سامنے ہے۔ بھگوان شری رام وِمان سے آئے، شری رام بھگت ہنومان چشم زدن میں سارا پہاڑ اُٹھائے سنجیونی بوٹی لے کر آئے۔ مہابھارت کے جنگ محل میں (لڑائی کے میدان سے دُور) جنگ کا حال سنتے رہے۔ بڑے بڑے راجہ، آتش فشاں کمان سے نکلے بان، رِشی منی کے شاپ، دیوتا کے وردان، کل تک ناقابلِ یقین باتیں اب آنکھوں دیکھی ہیں۔

بجلی کے ایک بٹن سے سو چراغ روشن، لودھی گارڈن کی ہری گھاس پر لوٹتا آدمی، ساری دُنیا میں بات کر رہا ہے۔ صدیوں کے جمع خرچ لمحوں میں ہو جاتے ہیں۔ انسان خلا میں جا پہنچا ہے۔ مشرق تا مغرب کی حدیں گھنٹوں میں عبور ہوتی ہیں۔ سائنس کی ترقی حیرت انگیز ہے۔

اِسی ترقی کا ایک تاریک پہلو دو ''جنگِ عظیم'' میں نمایاں ہوا۔ وادیِ کشمیر کی بربادی، افغانستان کی تباہی، نیویارک کے ٹریڈ ٹاورز کا گرایا جانا، جدھر دیکھو دہشت گردی، تباہی، بربادی، انسان آسمان میں اُڑنا تو سیکھ گیا مگر زمین پر چلنا بھول سا گیا ہے۔ انسانیت زخم خوردہ ہے۔ مذہبی لڑائی ہو کہ ملکی، انسان گھائل ہے۔ اپنے آپ سے پریشان ہے، خود سے بھی خوفزدہ ہے۔ انسانی رشتے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ میاں بیوی، بھائی بھائی، باپ بیٹے اجنبی سے ہوتے جا رہے ہیں۔ گھر بکھرنے سے لگے ہیں۔ انسان کا دُکھ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بے تعلقی، اکیلے پن، تنہائی میں ڈوبتا سا نظر آتا ہے۔ ہمہ جہت ترقی انسانی دلوں کو سکون نہ دے سکی۔ اس کے زخموں کا مرہم نہ بن سکی۔ میرے نزدیک ادب و شعر، انسان کے دل کی بات کرتا ہے۔ اُس کے دُکھ سکھ کی کہانی بیان کرتا ہے، اس کے نشاط و غم کی کیفیتیں شاعر کے اشعار میں رقصاں ہیں۔ وہ اپنی اور اپنی داخلی دُنیا کی بات کرتا ہے۔ میرے اس مجموعہ میں ایسے ہی زخموں کی بات کہی گئی ہے۔ میرے آپ کے رشتے کی بات، پیار کے رشتے، درد کے رشتوں کی بات کہی ہے۔

''احساس کے زخم'' حاضر ہے۔ کسی شعر میں آپ کو اپنی سی بات لگے تو مجھے لگے گا کہ میں

آپ کے قریب ہوں، یہی قربت، یہی داد میرا سرمایہ ہے۔

پندرہ سال پہلے کے حادثے نے وہ چوٹ دی کہ زندگی، زندگی ہی نہ رہی، بے حس ہو گیا تھا میں، گم ہو گیا تھا۔ نہ روشنی تھی، نہ راستہ، نہ منزل۔ جینے کی خواہش بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اُس گھپ اندھیرے میں ایک ''کرن'' نظر آئی جسے آپ ''رُوحی'' کے نام سے جانتے ہیں۔ اُس ننھی کرن سے راستے روشن ہوتے گئے۔ جینے کی تمنا پھر زندہ ہونے لگی۔ میری بیٹی رُوحی کا دُکھ کچھ کم نہ تھا۔ اُس کا دکھ ہی، درد کا رشتہ ہی، میرے لیے جینے کا موجب بنا۔ آج بھی ہے، آئندہ بھی رہے گا۔ اُس کے جیون ساتھی راجیو شانہ بشانہ قدم بہ قدم میرا، میری بیٹی کا ساتھ دیا ہے۔ میرے پاس اپنی بیٹی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ''احساس کے زخم'' اُس کو نذر کرتا ہوں۔

اپنے کچھ ہم عصروں کو یاد کروں تو غلام ربانی تاباںؔ، میری اُستاد ممتاز میرزا، بلّی کشی، اُوشا سوار، کے۔ ایل۔ جن سے میرے ادبی شوق کو جِلا ملی اُن کا ممنون و مشکور ہوں۔ علاوہ ازیں جن دوستوں نے ''خاموش'' محبت دی، اُن کے لیے خاموش دُعائیں۔

''احساس کے زخم'' پر جناب رفعت سروشؔ اور جناب مخمورؔ سعیدی نے جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ میرے لیے باعثِ عزت ہے۔ ''احساس کے زخم'' میرے تھے، اب آپ کے ہیں۔

—— پرہلادرائے دانشؔ

غزلیں

خاموش نگاہوں سے بس دیکھ لیا جائے
بے نام نظاروں کو کیا نام دیا جائے

اُس پیاس کی شدت کا اندازہ کیا جائے
ہنستے ہوئے ہونٹوں سے جب زہر پیا جائے

کچھ کر تو نہیں سکتے، ہم سوچتے رہتے ہیں
یہ کام کیا جائے وہ کام کیا جائے

جھونکے بھی ہواؤں کے خنجر بہ کف آتے ہیں
اس شہرِ ستمگر میں کیا سانس لیا جائے

ہر لمحہ یہ مر مر کر جینا کوئی جینا ہے
جینے کی طرح یارو اِک پل تو جیا جائے

یہ چاکِ گریباں تو سل جائے گا، سی لیں گے
احساس کے زخموں کو کس طرح سیا جائے

اب چھین نہ لیں بڑھ کر اِک جامِ طرب ہم بھی
تلخابۂ غم دانشؔ کب تک یہ پیا جائے

دیوار و در سے دُور ہمارا مکان ہے
سر پر ہمارے دُھوپ کا اِک سائبان ہے

یارو! غمِ حیات سے بے اعتنائی کیا
آیا ہے چند دِن کے لیے میہمان ہے

کب سے اِسے رہی ہے خریدار کی طلب
بازارِ زندگی میں جو غم کی دُکان ہے

FANKAR INTERNATIONAL PUBLISHERS
NEW DELHI-13

EHSAS KE ZAKHM (Poetry)
By Prahlad Rai 'Danish'

Year : 2003

Price : 100/-

کیوں ترکِ آرزو کے لیے کہہ رہے ہیں آپ
شاید یہ آرزو تو محبت کی جان ہے

دیوانگانِ عشق کا کیا پوچھتے ہو حال
بے حال ہو کے بھی تو عجب آن بان ہے

دیکھیں انھیں تو کھینچ بلاتا ہے یا نہیں
اے جذبِ شوق آج ترا امتحان ہے

جیسے کسی خلا میں کہیں جی رہے ہیں لوگ
دانش زمیں ہے اب نہ کوئی آسمان ہے

جب ذکرِ وفا آئے
دل کیوں مرا گھبرائے

یہ رات کی خاموشی
باتیں تری دُہرائے

پھر خود کو میں بھولا ہوں
پھر یاد کوئی آئے

جو تجھ کو گنوا بیٹھا
اپنے کو وہ کیا پائے

کچھ اور بڑھی دُوری
جب جب وہ قریب آئے

ہے کون سوا تیرے
اِس دل میں جو بس جائے

قسمت یہ کہاں دانشؔ
کوئی مرا ہو جائے

❖○❖

کیا نظمِ گلستاں ہے
ہر پھول پریشاں ہے

حالت جو ہماری ہے
چہرے سے نمایاں ہے

اِس ترکِ تعلّق پر
کیا تو بھی پشیماں ہے

ویرانیِ دل ، توبہ
یہ گھر تو بیاباں ہے

یہ دل ، یہ ہمارا دل
کیوں ہم سے گریزاں ہے

پیراہنِ ہستی میں
دامن نہ گریباں ہے

اب دل کا سکوں دانشؔ
اِک خوابِ پریشاں ہے

❖○❖

پیار تمھی سے کرتا ہے
یہ دل تم پر مرتا ہے

راتوں کا یہ سناٹا
مجھ سے باتیں کرتا ہے

تجھ سے بچھڑ کر کیا بتلائیں
کیسے وقت گزرتا ہے

کوئی سلگتے موسم میں
ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے

دل کے آئینے میں کون
بنتا اور سنورتا ہے

خاکۂ جاں میں پیار ترا
رنگ انوکھے بھرتا ہے

درد کا مارا دل دانشؔ
تنہائی سے ڈرتا ہے

❖○❖

خوابوں سے کوئی صورت رہ رہ کے گزرتی ہے
پھر پردۂ دل پر اِک تصویر اُبھرتی ہے

لہرائے گھٹا جیسے مہتاب کی وادی میں
یوں زلفِ سیہ اس کے شانوں پہ بکھرتی ہے

دُکھ بانٹنے آئے گا ہر پوچھنے والا کیا؟
کس کس کو بتائیں ہم کیا ہم پہ گزرتی ہے

تقدیر کا کیا شکوہ، تدبیر کرو کوئی
تدبیر ہی کرنے سے تقدیر سنورتی ہے

جاں کانپنے لگتی ہے دل ڈوبنے لگتا ہے
تنہائی کے زینے سے جب رات اترتی ہے

اِس غمکدۂ دل میں ہو کس کا گزر یارو
بس ایک اُداسی ہی اس گھر میں ٹھہرتی ہے

دنیا مری باتوں کو جھٹلائے نہ کیوں دانشؔ
دنیا مرے لہجے کی سچائی سے ڈرتی ہے

❖○❖

پھر پھول کھلے ہر سو پھر فصلِ بہار آئی
ہر کنجِ گلستاں سے آوازِ ہزار آئی

پھر اُس نے اِدھر دیکھا دُزدیدہ نگاہوں سے
بے تاب طبیعت پھر کچھ سوئے قرار آئی

یہ رات کی خاموشی، جذبات کی مدہوشی
ذرّوں سے ستاروں تک جو تجھ کو پکار آئی

احساس کے زخم

(شاعری)

پرہلاد رائے دانشؔ

فنکار انٹرنیشنل پبلشرز
نئی دہلی-۱۳

دارفتگیِ دل کے قرباں، کہ وفا اپنی
اِک لمحہ وہاں رہ کر اِک عمر گزار آئی

کیا خوبیِ قسمت تھی وہ کس کی محبت تھی
اُس محفلِ رنگیں سے جو سینہ فگار آئی

پھر سرد فضاؤں میں دل اپنا سلگتا ہے
پھر ٹھنڈی ہوا بھر کر دامن میں شرار آئی

کیا کھیل ہوا کا تھا اِک موجِ بلا دانشؔ
ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل پہ اُتار آئی

❖○❖

سختیِ دوراں سہنا ہے
ہم کو زندہ رہنا ہے

کہہ دیں، جو کچھ کہنا ہے
اتنا کیا چُپ رہنا ہے

اشک نہیں تو خونِ جگر
آنکھ سے کچھ تو بہنا ہے

تم سے دُور آکر بھی ہمیں
پاس تمھارے رہنا ہے

خار کو دیں کیا نام، اگر
پھول، چمن کا گہنا ہے

لاکھ عمارت ہو مضبوط
آخر اک دن ڈہنا ہے

سونے سے پہلے دانشؔ
ایک غزل تو کہنا ہے

بھری پُری اک دنیا ہے
کوئی پھر بھی تنہا ہے

آج پھر اس نے پوچھا ہے
حال تمھارا کیسا ہے

دل میں دُکھ کا اک دریا
دھیرے دھیرے بہتا ہے

آنکھیں نیند سے رُوٹھی ہیں
جب سے تجھ کو دیکھا ہے

اِک انجانا شخص، ہمیں
کیوں اپنا سا لگتا ہے

اُس کے گھر تک ، ہر رستہ
دل سے ہوکر جاتا ہے

کوئی مرے دل میں دانشؔ
مجھ سے چھپ کر بیٹھا ہے

Acc 12,023
0168,1N30x
f3

کیونکر اِس حال میں جیا جائے
اے غمِ ہجر کیا رکیا جائے؟

جیسے ہم منتظر نہ ہوں اُس کے
انتظار اُس کا یوں کیا جائے

ہے بہت تلخ زہرِ تنہائی
قطرہ قطرہ مگر پیا جائے

یہ مہکتا ہے تیری خوشبو سے
زخمِ احساس کیا سیا جائے

بند ہو جائے گی زباں اِک دن
اب جو کہنا ہو کہہ لیا جائے

کہہ رہے ہیں ہواؤں کے تیور
ہر سفینہ ڈبو دیا جائے

یاد اس کی بہت ہے اے دانشؔ
ذکر اس کا نہ اب کیا جائے

جذبِ دل آزما کے دیکھیں گے
آج ان کو بلا کے دیکھیں گے

توڑ کر اب حصارِ تنہائی
ان کی محفل میں جا کے دیکھیں گے

شدّتِ اضطرابِ شوق کا حال
پاس ان کو بٹھا کے دیکھیں گے

زخمِ دل ہنس پڑیں گے اپنے بھی
وہ اگر مسکرا کے دیکھیں گے

آج ان کو غزل کے پردے میں
قصۂ غم سنا کے دیکھیں گے

حسن کے ناز اُٹھانے والے اب
عشق کے ناز اُٹھا کے دیکھیں گے

سجدے مقبول ہوں نہ ہوں دانشؔ
سر تو ہم بھی جھکا کے دیکھیں گے

جس پر یہ اُداسی ہے
بس بات ذراسی ہے

کیوں عرضِ تمنا پر
وہ آنکھ خفا سی ہے

اِس شہرِ سیاست میں
ہر چیز سیاسی ہے

© پرہلاد رائے دانش
۳۴۵، نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی
فون (رہائش): 26835229، (دفتر) 23384833

Accno-
12023

اشاعت : ۲۰۰۳ء
قیمت : ایک سو روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
طباعت : ایم۔آر۔آفسیٹ پریس، دہلی
زیر اہتمام : ارشد علی خاں

GHALIB ACADEMY NEW DELHI

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

نازش بک سینٹر
۳۲۰۷، پھاٹک تیلیان، ترکمان گیٹ، دہلی-۱۱۰۰۰۶

گھیر میر علی خاں، امیر گنج، ٹونک-۳۰۴۰۰۱

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

موجود نہیں کچھ بھی
جو کچھ ہے قیاسی ہے

ہر غم کا ہے سرچشمہ
اِک غم، کہ اساسی ہے

چھائی ہے جو ہر جانب
کیسی یہ اُداسی ہے

وہ زلف سیہ دانشؔ
گھنگھور گھٹا سی ہے

اُن کی آنکھوں کے اشارے دیکھے
یعنی جینے کے سہارے دیکھے

کیا کہیں، دل کی جراحت کیا ہے
تم نے کب زخم ہمارے دیکھے

صبح تک آتا رہا تیرا خیال
رات بھر ہم نے ستارے دیکھے

پاس غیروں کا ہے اپنوں سے سوا
سب چلن ہم نے تمھارے دیکھے

اُس نے جب ہم سے نگاہیں پھیریں
دل پہ چلتے ہوئے آرے دیکھے

قہر ڈھاتا ہوا دریا پایا
سہمے سہمے سے کنارے دیکھے

کس کی نظروں نے وہ دیکھے ہوں گے
ہم نے دانشؔ جو نظارے دیکھے

دل ہے بربادِ تمنّا جاناں
اور ہم تجھ سے کہیں کیا جاناں

چھوڑ کر ہم نے تو رستے سارے
چُن لیا پیار کا رستا جاناں

ٹوٹ سکتا ہے، اگر تُو چاہے
درد سے دل کا یہ رِشتا جاناں

تو ملے ہم سے تو بتلائیں تجھے
ہم کو ارمان ہیں کیا کیا جاناں

چاہیں کیا چاہنے والے تیرے
تو جو چاہے وہی ہوگا جاناں

خواب بُننے لگیں آنکھیں کیا کیا
ہم نے جب جب تجھے دیکھا جاناں

تیرا دانشؔ ہے گریزاں تجھ سے
آگیا وقت یہ کیسا جاناں

قربتِ جاناں کے دن جب آ گئے
ہر طرف رنگینیاں برسا گئے

کچھ نہ تھا اُن کو اگر ہم سے لگاؤ
سامنے آئے تو کیوں شرما گئے

ہے وہ تھوڑی سی بھی ہم کو تو بہت
اپنی آنکھوں سے جو وہ چھلکا گئے

کرلیا وعدوں پر اُن کے اعتبار
آج ہم اک اور دھوکا کھا گئے

عشرتِ رفتہ کا خمیازہ تو دیکھ
پیتے پیتے ہوش میں ہم آگئے

اب ہمارے دل کا پیچھا چھوڑ دے
اے ہجومِ یاس ہم گھبرا گئے

جستجوئے دوست میں ہم اس طرح
کھو گئے دانشؔ کہ خود کو پا گئے

چھُٹ کے ہم تم سے کہاں جائیں گے
ساتھ تم ہو گے، جہاں جائیں گے

ہم کسی راہ گزر سے گزریں
چھوڑ کر اپنا نشاں جائیں گے

پھول مہکائیں گے ویرانوں میں
تیرے دیوانے جہاں جائیں گے

ہم وہ بسمل ہیں کہ مقتل کی طرف
جب گئے، رقص کناں جائیں گے

خامُشی ہو گی بہت، اس کے حضور
ساتھ کیا لفظ و بیاں جائیں گے

بزمِ عشرت سے تری ہم اِک دن
غم بہ دل، درد بہ جاں جائیں گے

اُس ستمگر کے مقابل دانشؔ
ہم تو بے تیر و سناں جائیں گے

فہرست

حرفِ دانش/ رفعت سروش ۷
دل اور دُنیا کا قصّہ گو: پرہلادرائے دانش/ مخمور سعیدی ۱۱
اپنی بات/ پرہلادرائے دانش ۱۵

○ **غزلیں:**

- خاموش نگاہوں سے بس دیکھ لیا جائے ۱۷
- دیوار و در سے دُور ہمارا مکان ہے ۱۹
- جب ذکرِ وفا آئے ۲۱
- کیا نظمِ گلستاں ہے ۲۳
- پیار تھی سے کرتا ہے ۲۵
- خوابوں سے کوئی صورت رہ رہ کے گذرتی ہے ۲۷
- پھر پھول کِھلے ہر سُو پھر فصلِ بہار آئی ۲۹
- سختیِ دوراں سہنا ہے ۳۱
- بھری پُری اِک دُنیا ہے ۳۳
- کیونکر اس حال میں جیا جائے ۳۵
- جذبِ دل آزما کے دیکھیں گے ۳۷
- جس پر یہ اُداسی ہے ۳۹
- اُن کی آنکھوں کے اشارے دیکھے ۴۱
- دل ہے بربادِ تمنّا جاناں ۴۳
- قربتِ جاناں کے دن جب آ گئے ۴۵
- چُھٹ کے ہم تم سے کہاں جائیں گے ۴۷
- رُسوائیِ طلب کی شروعات کب ہوئی ۴۹
- اُس سے ہرگز نہ کچھ سوال کرو ۵۱

❖○❖

رسوائیِ طلب کی شروعات کب ہوئی
اُس کم سخن سے جانے مری بات کب ہوئی

اب بن گئی جو پاؤں کی زنجیر، یہ تھکن
مجھ کو خبر نہیں کہ مرے سات کب ہوئی

جب اہلِ غم خود اپنی ہی پہچان کھو چکے
بچھڑے ہوؤں سے اِن کی ملاقات کب ہوئی

سرسبز خونِ دل سے رہیں غم کی وادیاں
اس سرزمیں پہ رنگ کی برسات کب ہوئی

تاریکیاں، برہنہ نظاروں کو ڈھانپ لیں
اس شہرِ بے لباس میں وہ رات کب ہوئی

اُن کے حضور، یوں تو بہت کچھ کہا گیا
لیکن مجالِ عرضِ شکایات کب ہوئی

دانشؔ ہم ان کی بزم میں جاتے رہے تو ہیں
لیکن وہاں ہماری مدارات کب ہوئی

اس سے ہرگز نہ کچھ سوال کرو
یعنی ممکن کو تم محال کرو

موت کا دھیان ناگزیر سہی
زندگی کا بھی کچھ خیال کرو

شہرِ دل میں یہ ابتری کب تک
اقتدار اپنا تم بحال کرو

ہم خزاں پر نگاہ رکھیں گے
تم بہاروں کی دیکھ بھال کرو

ہے اسی سے تو زندگی دل کی
زخمِ دل کا نہ اندمال کرو

یہ زمیں آرزُو کا مدفن ہے
اِس زمیں کو نہ پائمال کرو

نام، اہلِ کمال میں آئے
تم بھی دانشؔ کوئی کمال کرو

کب سے خوابوں کی رہ گزار میں ہیں
ہم یہاں کس کے انتظار میں ہیں

گھُل نہ جائیں خزاں کی زردی میں
سُرخیاں جو رُخِ بہار میں ہیں

ہے کدورت دلوں پہ چھائی ہوئی
آئینے، پردۂ غُبار میں ہیں

کیا کریں سیرِ کائنات، کہ لوگ
اپنی ہی ذات کے حصار میں ہیں

اس نے دیکھا تو ہے ہماری طرف
ہم بھی شاید کسی شمار میں ہیں

صبح ہم سے ابھی نہ بات کرے
ہم ابھی رات کے خمار میں ہیں

زندگی ہم پہ جبر ہے دانشؔ
جانے ہم کس کے اختیار میں ہیں

کبھی گریۂ دَمِ صبح ہے، کبھی نالۂ سرِ شام ہے
کوئی لمحۂ طرب آشنا ترے غم زدوں پہ حرام ہے

اسے پی، شراب سمجھ کے پی، یہی میکدے کا نظام ہے
یہ جو زہر شیشہ بہ شیشہ ہے، یہ جو خون جام بہ جام ہے

مرے روز و شب ہیں نئے نئے نہ وہ صبح ہے نہ وہ شام ہے
تری آرزو مرے واسطے، نئی زندگی کا پیام ہے

یہی میرا حزن شعار دل، یہی ایک اجڑا دیار دل
اسی ایک اُجڑے دیار میں، ترا مدّتوں سے قیام ہے

تو نہیں شریکِ سفر تو کیا کہ رفیقِ رہروِ آرزو
ترا دھیان جادہ بہ جادہ ہے، تری یاد گام بہ گام ہے

تری بزم سے کوئی واسطہ؟ وہ خدا کا گھر ہو کہ بتکدہ
نہ فضا میں ہیں یہ لطافتیں، نہ یہ رونقِ در و بام ہے

وہی اضطرابِ نفس نفس ، وہی انتشارِ نظر نظر
ترے بعد دانشؔ زار کو نہ قرار ہے نہ قیام ہے

کس سے ساقی کو گلہ ہے یہ بلا نوشی کا
کس پہ الزام ہے، بڑھتی ہوئی مدہوشی کا

کون رہ سکتا ہے تا عمر خود اپنے سے جدا
حوصلہ کس کو ترے غم سے ہم آغوشی کا

عمر بھر خود کو سزاوارِ تغافل جانا
مدّعا ہم نے نہ سمجھا تری خاموشی کا

کر رہے ہیں وہ عطا بارِ غم اپنا اے دل
وقت ہے فرضِ محبت سے سبکدوشی کا

حسن کے اذنِ مسرّت سے بھی مائل بہ گریز
عشقِ ناشاد یہ عالم تری غم کوشی کا

میں نے اشکوں سے چنی ہے شبِ غم کی افشاں
مجھ کو دعویٰ ہے ستاروں سے بھی ہمدوشی کا

اپنی رسوائی کی معراج مبارک دانشؔ
بزمِ خوباں میں ہے چرچا تری مے نوشی کا

- کب سے خوابوں کی رہ گذار میں ہیں ۵۳
- کبھی گریۂ دمِ صبح ہے، کبھی نالۂ سرِ شام ہے ۵۵
- کس سے ساقی کو گلہ ہے یہ بلانوشی کا ۵۷
- ہے صبح کی آنکھوں میں بھی اک خواب کا سایہ ۵۹
- وہ بہ ہر سُو نگراں ہے کتنا ۶۱
- چلتی ہے دل پہ درد کی تلوار کس لیے ۶۳
- مجبور ہوں، آہ کر رہا ہوں ۶۵
- کلِ مہر بہ لب رات سے میں سنتا رہا کیا ۶۷
- اوّل اوّل خود کو تنہا پا کے گھبرائے گا وہ ۶۹
- کون ہم سے سوا سمجھتا ہے ۷۱
- یہ دل بنا ہے اگر تیری آرزو کے لیے ۷۳
- متاعِ دل کو سرِ راہ لا کے ڈالا ہے ۷۵
- وہی جو دشمنِ جاں تھا، رفیقِ جاں ہوگا ۷۷

○ **نظمیں**

- واہمے کا خاتمہ ۷۹
- گھٹن کا علاج ۸۰
- پہرا ۸۲
- احتیاط ۸۳
- پھر وہی موڑ ۸۴
- تب اور اب ۸۵
- شام کا جادو ۸۷
- ہجر کی ایک کیفیت ۸۹
- ایک صبح کا تاثر ۹۱
- بندھن ۹۲

○ **قطعات** ۹۳

○ **رُباعیات** ۱۰۵

ہے صبح کی آنکھوں میں بھی اِک خواب کا سایہ
یعنی شبِ رفتہ کی تب و تاب کا سایہ

قدموں کے تلے دھوپ حیاتِ گزراں کی
آنکھوں میں کسی لمحۂ شاداب کا سایہ

مجھ سے جو ملا کوئی، مجھی سا نظر آیا
چہرے پہ چمکتا تھا مرے خواب کا سایہ

روشن ہے ابھی وقت کے تاریک کھنڈر میں
سنولائی ہوئی اِک شبِ مہتاب کا سایہ

ساحل پہ کھڑے ہو کے نہ طوفاں کی کرو سیر
ساحل پہ پڑے آ کے نہ گرداب کا سایہ

میخانے سے اُٹھتے نہ قدم جانبِ مسجد
ہم پر نہ رہا منبر و محراب کا سایہ

دانشؔ یہ حقیقت ہے کہ اربابِ ہوس کو
چھو کر نہ گیا عشق کے آداب کا سایہ

وہ بہ ہر سو نگراں ہے کتنا
اس کو اب خود پہ گماں ہے کتنا

آج وہ گھر سے نہ نکلا ہوگا
شہر میں امن و اماں ہے کتنا

دل کے سب غم ہی پرانے ہوئے اب
اِک ترا درد جواں ہے کتنا

کب، کہاں آگ لگی ہو جانے
ہر طرف اب بھی دُھواں ہے کتنا

وقت کے ساتھ بہے جاتے ہیں ہم
تیز، یہ سیلِ رواں ہے کتنا

روکشِ حسنِ یقیں ہو جیسے
خوش نما نقشِ گماں ہے کتنا

دے کے دل سوچ رہے ہو دانشؔ
عشق میں جی کا زیاں ہے کتنا

چلتی ہے دل پہ درد کی تلوار کس لیے
ہم ہیں یہ خود سے برسرِ پیکار کس لیے

چھوڑو بھی اس کی آس، وہ غم ناشناس ہے
جی کو لگا رکھا ہے یہ آزار کس لیے

حرفِ طلب ہی اب سے زباں پر نہ لائیے
دیجے کسی کو زحمتِ انکار کس لیے

لے کر کوئی غرض ہی ترے پاس آئے تھے
ہم بے غرض نہیں تھے یہ تکرار کس لیے

اپنی صدا پہ در ہی نہ جب تیرا وا ہوا
بیٹھے رہیں گے ہم پسِ دیوار کس لیے

جس کو ہمارے ساتھ سروکار کچھ نہ ہو
رکھیں ہم اس کے ساتھ سروکار کس لیے

دانشؔ اب اپنے حال پہ افسوس مت کرو
اِک بے وفا سے تم نے کیا پیار کس لیے

مجبور ہوں، آہ کررہا ہوں
نادم ہوں، گناہ کررہا ہوں

پھولوں کی تلاش ہے نظر کو
کانٹوں پہ نگاہ کررہا ہوں

اے برق ٹھہر کہ اپنا گلشن
میں خود ہی تباہ کررہا ہوں

بس ایک تری خوشی کی خاطر
ہر غم سے نباہ کر رہا ہوں

اس کی نظر اپنی سمت پاکر
ہر سمت نگاہ کر رہا ہوں

منزل کا تو کچھ پتا نہیں ہے
سجدے سرِ راہ کر رہا ہوں

کس چیز کی جستجو ہے دانشؔ
ہر شے پہ نگاہ کر رہا ہوں

کل، مہر بہ لب رات سے میں سنتا رہا کیا
روتی تھی اندھیرے میں وہ میری ہی صدا کیا

یہ لاکھ اُجالوں میں بھی دیکھیں اک اندھیرا
حیران ہوں، آخر مری آنکھوں کو ہُوا کیا

سرمایۂ جاں تھا وہی اک شعلۂ احساس
جب برف گری دل پہ تو جینے کو رہا کیا

دَم توڑتے لمحوں سے اُلجھتی ہوئی سانسیں
چاہا تو بہت کچھ تھا مگر ہم کو مِلا کیا

گھر چھوڑ کے ویرانے کی جانب جو چلے ہم
یہ بیٹھے بٹھائے ہی ہمیں آج ہُوا کیا

یاد آئیں پھر اک صبحِ ملاقات کی باتیں
خاموش فضاؤں نے سرِ شام کہا کیا

کیوں نام پہ اب اس کے دھڑکتا نہیں یہ دل
دانشؔ وہ مرا دوست مجھے بھول گیا کیا

حرفِ دانش

ہر دَور کا ادب اپنے زمانے کا آئینہ ہوتا ہے اور اس کو آئینہ بنانے کے لیے کسی باضابطہ آئینہ گر کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ادب خود بخود اس رنگ میں ڈھلتا جاتا ہے۔ باضابطہ تحریکات یہ کام مصنوعی طور پر کرتی ہیں اور چند شخصیات اپنے مخصوص مفادات اور سوچے سمجھے پروپیگنڈے کے تحت اس کا اعلان کرتی ہیں کہ آج سے ادب بدل رہا ہے۔ اب ماضی کا ادب یکسر ناکارہ ہو چکا ہے۔ فنکاروں سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ نیا ادب تخلیق کریں —— اور تخلیق کار کو "چابی کا کھلونا" بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے تماشے ہمارے ادب میں بہت ہوئے ہیں جب فنکاروں کو کٹھ پتلی بنا کر نچایا گیا ہے۔

دراصل ادب میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں غیر محسوس طور پر اور زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ۔ جب زندگی مجموعی طور پر کسی انقلاب سے دوچار ہوتی ہے تو ادب کے زاویے خود بخود بدل جاتے ہیں —— جب کنگھی چوٹی کا معاشرہ تھا تو ادب میں بھی اسی طرح کی چیزیں فروغ پاتی تھیں۔ مشکل سے چالیس پچاس سال پہلے کی بات ہے جب حسن کی فطرت مانی جاتی تھی شرمانا، لجانا، پردہ کرنا۔ اس وقت حسن کی ایک جھلک قیامت برپا کرتی تھی۔ اس معاشرے میں ایسے شعر کہے جاتے تھے:

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیے مسکرا کے ہاتھ

وہ اس طرح میرے برابر سے گزرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

نیچی نظر کے ہاتھوں لٹ لٹ گئے ہیں تخشبؔ
رد ہو سکیں نہ ہم سے خاموش التجائیں

یا کسی کا ننگے سر کوٹھے پر آنا نیچی نظروں سے بجلیاں گرانا وغیرہ وغیرہ

آج جب ہمارا معاشرہ بدل چکا ہے اور مشینی دَور نے انسان کی نفسیات بدل دی ہیں، صنفِ نازک اب مَردوں کے دوش بدوش دفتروں، کارخانوں اور ہوائی جہازوں میں کام کر رہی ہے تو

❖○❖

اوّل اوّل خود کو تنہا پا کے گھبرائے گا وہ
آخر آخر خوگرِ تنہائی ہو جائے گا وہ

جاگتے میں خواب اُسے بیتے دنوں کے آئیں گے
نیند میں گزری ہوئی راتوں کو دُہرائے گا وہ

کسمپرسی کی اُداسی حد سے بڑھ جائے گی جب
اپنی ہی پرچھائیں سے بڑھ کر لپٹ جائے گا وہ

بھاگنے کو کوئی دروازہ نکل ہی آئے گا
سر کو جب زنداں کی دیواروں سے ٹکرائے گا وہ

زندگی کے ساتھ کچھ اچھا نہیں اس کا سلوک
ایک دن اپنی روش پر خود ہی پچھتائے گا وہ

اس کے احساسات ہی اس کو ڈرائیں گے بہت
اپنے ہی جذبات سے خائف نظر آئے گا وہ

دشمنی کا زہر تو دانشؔ نے ہنس کر پی لیا
دوستی کا ڈنک اگر کھایا تو مر جائے گا وہ

❖○❖

کون ہم سے سوا سمجھتا ہے
کس سے پوچھیں کہ زندگی کیا ہے

آج کچھ دیر رو لیے ہم بھی
آج کچھ دِل کا بوجھ ہلکا ہے

اب نہ آئے گا وہ، خبر تھی مگر
راستہ اس کا پھر بھی دیکھا ہے

اب مراسم میں وہ تپاک نہیں
ملنا جلنا یہ چند دن کا ہے

اور تو یاد ہے اُسے سب کچھ
وہ مگر خود کو بھول بیٹھا ہے

عشق جب دل کا ہم سفر ہو جائے
راستہ رُخ بدلنے لگتا ہے

بے تمنّا گزار دیں دانشؔ
اب ہماری یہی تمنّا ہے

یہ دل بنا ہے اگر تیری آرزو کے لیے
نظر ملی ہے مجھے تیری جستجو کے لیے

دیا ہے حوصلۂ آرزو اگر دل کو
زباں بھی دے مجھے اظہارِ آرزو کے لیے

کسی سے سن بھی لیا تم نے میرا حال تو کیا
کہ مضطرب ہے یہ دل عرضِ رو بہ رو کے لیے

بہار آئی چمن میں اِس احتیاط کے ساتھ
چمن کے پھول ترستے رہیں نمو کے لیے

بہار، تیرے رُخِ لالہ گوں کی مشاطہ
نسیم، شانہ تری زلفِ مشک بو کے لیے

چمن پرست ہیں ہم رنگ و بو کے دیوانے
چمن، اِک آئینہ لیلائے رنگ و بو کے لیے

وہ آشیاں کی تباہی پہ روئیں کیا دانشؔ
جو جی رہے ہیں گلستاں کی آبرو کے لیے

❖○❖

متاعِ دل کو سرِ راہ لا کے ڈالا ہے
سنا یہ ہے: وہ اِدھر سے گزرنے والا ہے

گزر رہی ہے جو ہم پر وہ کہہ تو سکتے ہیں
مگر کہیں تو یہاں کون سننے والا ہے

تری وفا پہ بھروسا سہی، مگر دل نے
کبھی کبھی تو عجب وسوسوں میں ڈالا ہے

اگر ملے نہ کوئی ہم سفر تو کیا شکوہ
کہ ہم نے سب سے الگ راستہ نکالا ہے

حیاتِ شوق بس اِک لغزشِ مسلسل تھی
ترے خیال نے کیا کیا مگر سنبھالا ہے

اجل کی راہ سے کترا کے ہم کدھر جائیں
کہ زندگی نے اسی راستے پہ ڈالا ہے

ڈرو نہ وقت کے طوفاں سے اس قدر دانشؔ
یقیں رکھو کہ یہ دریا اترنے والا ہے

وہی جو دشمنِ جاں تھا، رفیقِ جاں ہو گا
اب اس طرح بھی محبت کا امتحاں ہو گا

ہمارا عشق ہی عنوانِ داستاں ہو گا
تمھارے حسن کا چرچا جہاں جہاں ہو گا

چلے ہو مسجدِ ویراں سے بتکدے کی طرف
کرو گے کیا؟ یہی عالم اگر وہاں ہو گا

یہی زمین یہی آسماں، ہمارے لیے
نئی زمیں نہ نیا کوئی آسماں ہوگا

سنا ہے آج یہ دنیا بدلنے والی ہے
سنا ہے آج کوئی ہم پہ مہرباں ہوگا

قرارِ دیدہ و دل لے کے آرہا ہے کوئی
اب انتظار کسی کا نہ رائیگاں ہوگا

وہ اس زمین کی مخلوق کب ہے اے دانشؔ
ٹھکانہ اس کا ستاروں کے درمیاں ہوگا

کہاں ہے وہ روایتی غزل کی شرمانے لجانے والی عورت۔ اور اسی طرح آج کا انسان ہنگامی مسائل اور شہری زندگی کی بے مروّتی اور تنہائی کا شکار ہے تو از خود یہ موضوعات ہماری شاعری میں در آئے ہیں۔ ان پر کسی ازم یا تحریک کی مہر نہیں لگی ہے۔ اور بغیر مہر لگی ہوئی شاعری ہی دراصل معاشرے کی ترجمان ہوتی ہے۔ آج کے معاشرے کا شعر یہ ہے جو اس دَور کے انسان کی بے سروسامانی اور غیر محفوظ زندگی کا عکس ہے:

دیوار و دَر سے دُور ہمارا مکان ہے　　سر پر ہمارے دھوپ کا اِک سائبان ہے

اس شعر کے خالق پرہلاد دانش کو نہ ترقّی پسند تحریک سے کوئی تعلق رہا نہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اُلٹ پلٹ سے۔ وہ تو ایک آزاد ذہن رکھنے والا اور اپنے طور پر سوچنے والا شاعر ہے اور انھی خیالات کی عکاّسی اپنے کلام میں کرتا ہے۔ اب ناقدینِ فن اسے کس خانے میں فٹ کرتے ہیں اس کی اُسے پروا نہیں۔ اور کسی سچّے شاعر کو اس درجہ بندی کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ وہ دُنیا کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان کے تجربے صاف جھلکتے ہیں، کہیں ایک مشّاق فنکار کی طرح وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کا شعر اکثریت کے جذبات کی عکاّسی کرتا ہے:

کیا نظمِ گلستاں ہے　　ہر پھول پریشاں ہے
پیراہنِ ہستی میں　　دامن نہ گریباں ہے

راتوں کا یہ سناٹا　　مجھ سے باتیں کرتا ہے

جاں کانپنے لگتی ہے دل ڈوبنے لگتا ہے　　تنہائی کے زینے سے جب رات اُترتی ہے

ان سادہ اور پُرکار شعروں میں احساس کی شدّت شخصی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی پریشاں حالی، بیقراری اور اضطراب نمایاں ہے۔ ان اشعار میں لفظوں کا انتخاب اور اندازِ بیان روایتی غزل سے یکسر مختلف ہے۔ Abstract کیریکٹر مجسّم ہوتے نظر آتے ہیں۔ سناٹے کا باتیں کرنا، تنہائی کے زینے سے رات کا اُترنا، یہ استعاراتی انداز بدلتے وقت اور ماحول کی دین ہے — مگر یاسیت انسانیت کا مقدّر نہیں۔ انسان نے ہمیشہ ظلمت سے نور کاڑھا ہے، اور مصائب سے نبرد آزما ہونا ہی انسان کی شان ہے اور وہ مسائل سے آنکھ ملاتے ہوئے مردانہ وار زندہ رہتا ہے۔ دانش کا شعر ہے:

سختی دوراں سہنا ہے　　ہم کو زندہ رہنا ہے

اور جب رجائیت کا یہ عالم ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ مصائب کے پہاڑ کھڑے کرنے والے ہی بالآخر ہمدرد بن جاتے ہیں۔ ایسے اتفاقات قدرت کے کھیل جیسے نظر آتے ہیں:

کیا کھیل ہَوا کا تھا اِک موجِ بلا دانش　　ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل پہ اُتار آئی

دانش کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں غم اور خوشی، آس اور یاس آنکھ مچولی کھیلتے

نظمیں

واہمے کا خاتمہ

وہ میرا عکس تھا، پیکر مرے خیالوں کا
نہیں، وہ کوئی نہ تھا، وہ تو میرا دشمن تھا
جو میرے پاس، مجھے قتل کرنے آیا تھا
توہّمات کا خنجر جو ساتھ لایا تھا

یہ میری موقع شناسی تھی، ہوش مندی تھی
کہ میں نے بڑھ کے گریبان اس کا پھاڑ دیا
برہنہ تن اسے زندہ زمیں میں گاڑ دیا

گھٹن کا علاج

چلو کسی کی مذمّت کریں، زباں کھولیں
بہت دنوں سے جو تالا لگا ہے ہونٹوں پر
تو دل میں کتنی گھٹن، کتنی زہرناکی ہے

کہیں یہ زہر اُگل دیں، کسی کو گالی دیں

مگر یہ لوگ تو شاید سب اپنے جیسے ہیں
شکستگی کا اک آئینہ جن کے چہرے ہیں

ہمارے نام، کہ ملتے ہوئے سے نام ہیں سب
الگ الگ ہیں کہاں ہم، اک اژدہام ہیں سب
اِک اژدہام جو پُرشور شاہراہوں پر
خموش رینگتا رہتا ہے، سر جھکائے ہوئے
نہ آنکھ اٹھانے کی مہلت، نہ لب کشائی کی تاب
نگاہ و دل کی اسیری، خموشیوں کا عذاب

اِسے برا نہ کہیں، کیوں نہ اس کے ساتھ چلیں
دل اپنا اس کو دِکھائیں، دُکھ اس کا ہم بھی سنیں
کہ اس طرح بھی تو ممکن ہے اس گھٹن کا علاج

❖○❖

پہرا

کھڑکیاں بند ہوئیں
نغمۂ دیدار کی لے ٹوٹ گئی
کھو گیا دھند میں خاموشی کی
کھلکھلاتی ہوئی گل رنگ صدا کا چہرہ
لگ گیا رنگ کی لہروں پہ یہ کیسا پہرا

تیرتی ہے مری مجروح سماعت میں مگر
گم شدہ نغمۂ دیدار کی لے
دیکھتی ہیں مری بے نور نگاہیں اب بھی
کھلکھلاتی ہوئی گل رنگ صدا کا چہرہ
مجھ سے کہتا ہے جو سرگوشی میں:
کیوں کوئی رنگ کی لہروں پہ بٹھائے پہرا
رنگ کی لہر تو اِک خواب ہے، اِک نغمہ ہے
اور نغمے کو بھلا قید کیا ہے کس نے
خواب کو بھی کوئی زنجیر پنھا سکتا ہے؟

احتیاط

نہ کچھ کہو، نہ سنو، مت اِدھر اُدھر دیکھو
زباں بھی، کان بھی، آنکھیں بھی اپنی بند رکھو

جو کچھ کہوگے تو پھیلے گا سچ کا زہر یہاں
جو کچھ سنوگے تو سننا پڑے گا جھوٹ تمھیں
جو آس پاس کا منظر ہے، اس کو دیکھوگے
تو ضبط کر نہ سکوگے، فساد جاگے گا

پھر وہی موڑ

پھر وہی موڑ سرِ جادۂ زیست آیا ہے
جس سے اِک روز میں کترا کے نکل آیا تھا
اور پھر بعد میں پچھتایا تھا، جھنجھلایا تھا

ہاں وہی موڑ پھر آیا ہے سرِ جادۂ زیست
جس سے اس بار بھی میں بچ کے گزر جاؤں گا
اور پھر بعد میں پچھتاؤں گا، جھنجھلاؤں گا

سوچتا ہوں کہ یہ افتادِ طبیعت کیا ہے
روک لیتی ہے جو مجھ کو وہ جبلّت کیا ہے

تب اور اب

چاند اِسی طرح جب بھی روشن تھا
آسماں سے اُتر کے آئی تھیں
خوشبوؤں کی مہکتی وادی میں
خیر مقدم ہمارا کرنے کو
چاندنی رات کی حسیں پریاں

نکہت و نور کی فضاؤں میں
دل کی دھڑکن کے ساز پر تا دیر
پیار کے گیت ہم نے گائے تھے
سرمدی زمزمے سنائے تھے

چاند اُسی طرح اب بھی روشن ہے
آسماں سے اُتر کے آئی ہیں
میرے سونے اُداس آنگن کی
تیرہ بختی پہ طنز کرنے کو
چاندنی رات کی حسیں پریاں

اور آج اِن حسین لمحوں میں
دل کی دھڑکن کے ساز پر تنہا
پیار کا مرثیہ میں گاؤں گا
جاں بہ لب زمزمے سناؤں گا

ہو خدا جانے تم کہاں اس وقت!

شام کا جادُو

پرانی داستاں پھر اک نئے عنواں سے دُہرائیں
چلو اِک بار پھر اُس کوچۂ رنگیں میں ہو آئیں

سلونی شام یہ کیسی مہک دامن میں لائی ہے
ہوا اٹھکھیلیاں کرتی یہ کس جانب سے آئی ہے
اُفق پر یہ جو اِک پہلا ستارہ جگمگایا ہے
یہ کس کی مسکراہٹ دیکھ کر یوں مسکرایا ہے
طبیعت کی اُداسی خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
فضا کی خامشی یہ کس کے افسانے سناتی ہے
دُھندلکے کون سا رستہ نگاہوں کو سُجھاتے ہیں
یہ کب کے ٹوٹے رشتے ہیں جو خود ہی جڑتے جاتے ہیں
یہ کس کی یاد کا مہتاب روشن ہوتا جاتا ہے
جھروکے سے اُفق کے کون ہنس ہنس کر بلاتا ہے

پسِ ظلمت یہ کیسی روشنی محسوس ہوتی ہے
نظر انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
نشہ آنکھوں میں یوں جاگا ہے خوابِ شادمانی کا
بدلتا جارہا ہو جیسے منظر زندگانی کا
وہ لمحے جیسے لوٹ آئے جو اُس محفل میں گزرے تھے
بہشتِ آرزو، خلدِ نگاہ و دل میں گزرے تھے
وہی زلف و لب و رخسار کا نظّارۂ رنگیں
فضا، جیسے حسیں جلووں کا اک گہوارۂ رنگیں
فسوں پرور حسیں صبحوں، جواں شاموں کی اِک دُنیا
ستارہ چشم، لالہ رُخ گل اندامُوں کی اِک دُنیا
اُدھر دل کھنچنے لگتا ہے جو یوں بے اختیار اب تک
تعجب کیا کہ ہو اپنا کسی کو انتظار اب تک
سرِ شام اب بھی خوابوں کی حسیں محفل سجاتا ہو
درِ دل پر امیدوں کے دِیے کوئی جلاتا ہو

چراغِ آرزوئے دل کی لو ہم بھی بڑھالائیں
چلو اک بار پھر اُس کوچۂ رنگیں میں ہو آئیں

ہیں۔ نہ وہ زندگی کو محض عیش و آرام اور کامرانی و کامیابی ہی تصور کرتے ہیں اور نہ غم و یاس کے طوفان انھیں غرق کر سکتے ہیں۔ ان کیفیات کے اشعار ان کی غزلوں میں مختلف رنگوں اور پیکروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہر جگہ کوئی نیا تجربہ، کوئی نئی کیفیت اور کوئی نئی لہر نظر آتی ہے۔ کچھ اشعار:

بارِ غمِ حیات سے بے اعتنائی کیا آیا ہے چند دن کے لیے، میہمان ہے

خار کو دیں کیا نام، اگر پھول چمن کا گہنا ہے

لاکھ عمارت ہو مضبوط آخر اِک دن ڈہنا ہے

(یہ شعر ''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت'' کی تفسیر ہے۔)

دل میں دُکھ کا اِک دریا دھیرے دھیرے بہتا ہے

ہے بہت تلخ زہرِ تنہائی قطرہ قطرہ مگر پیا جائے

قہر ڈھاتا ہوا دریا پایا سہمے سہمے سے کنارے دیکھے

اب ہمارے دل کا پیچھا چھوڑ دے اے ہجومِ یاس ہم گھبرا گئے

سرسبز خونِ دل سے رہیں غم کی وادیاں اس سرزمیں پہ رنگ کی برسات کب ہوئی

تاریکیاں برہنہ نظاروں کو ڈھانپ لیں اس شہرِ بے لباس میں وہ رات کب ہوئی

کب سے خوابوں کی رہگوار میں ہیں ہم یہاں کس کے انتظار میں ہیں

میں نے مختلف کیفیاتِ غم و مسرّت کے یہ اشعار عمداً ایک ساتھ لکھے ہیں کہ دانش کی فکر کی پرواز کا اندازہ ہو سکے، ان کی غزلوں کا غالب رجحان تنہائی، رات، سناٹا اور سناٹے میں کوئی آئے، خواب نظارہ۔ دراصل وہ اپنے خواب کے نگر میں کسی کے انتظار میں ہے۔ اور جب تک آنکھیں ہیں انتظار رہتا ہے تو اُمید بھی باقی رہتی ہے۔ یہی اُمید کی کرن ہے جو رہ رہ کر ان کی شاعری میں چمکتی ہے اور ان کو قنوطی نہیں ہونے دیتی۔ ان کے یہاں کسی کی یاد کا سہارا اتنا قوی ہے کہ وہ ہر طوفان سے ہنستے ہنستے کھیلتے ہیں۔ دراصل یہ یاد ایک استعارہ ہے ایک ایسی شخصیت کا جو دانش کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ اور ایک لطیف جھونکے کی طرح گزر گئی۔ اس کی یادوں کی جھلملاہٹیں ہیں جو اُن کی راتوں میں ستاروں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اس کی یادوں کی شمعیں ہیں جو سناٹے کی دیواروں پر قطار در قطار جھلملاتی نظر آتی ہیں۔ ایسی یادیں شاعری میں ایک کسک، ایک تڑپ اور جذبِ دروں کی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ دانش جس سانحۂ فراق سے گزرے وہ ان کے دل میں تخلیقیت

ہجر کی ایک کیفیت

یہ رُت، یہ رنگینیاں، یہ موسم
یہ ہر طرف سرخوشی کا عالم
طیورِ آوارہ چہچہائے
لچکتی شاخوں نے ساز اٹھائے
نشاطِ فکر و نظر کا عنواں
جنوں نواز و فسوں بہ داماں
یہ مسکراتے حسیں نظارے
فضا کے دیوانہ گر اشارے
ہوا کا چھیڑا ہوا یہ سرگم
یہ گنگناہٹ یہ چھم چھما چھم

درخت بانہوں میں بانہیں ڈالے
نمو کی سرمستیاں سنبھالے
بہم کچھ اس طرح جھومتے ہیں
گماں یہ ہو، خود کو چومتے ہیں
شفق کی گل گوں قبا پہن کر
زمیں لجائی دُلہن سی بن کر
یہ ذرّے ذرّے کی خوش ادائی
نگارِ فطرت کی خود نمائی
جو دل کی دھڑکن بڑھا رہی ہے
نظر کو بے خود بنا رہی ہے

تمھیں خبر ہے، تمھاری خاطر
تمھارا ہجراں نصیب شاعر
تمھاری یادوں کے سائے سائے
تمھارے غم کو گلے لگائے
گریز اِن سب سے کر گیا ہے
نظر بچا کے گزر گیا ہے

ایک صبح کا تاثر

ہُوا شب کا تاریک پردہ جو شق
فضا مسکرائی بہ رنگِ شفق

اُفق تا اُفق رنگ پھیلے کئی
درختوں نے پہنیں قبائیں نئی

ہُوا دُھند سے ایسے سورج طلوع
کہ جیسے نئی زندگی ہو شروع

یہ چاروں دِشاؤں میں ہیجان سا
بپا نور و نکہت کا طوفان سا

کہیں لالہ و گل کہیں نسترن
شگوفے کھلاتی چمن در چمن

کچھ آزاد روحیں ہیں محوِ خرام
نسیمِ سحر ہے اُنھی کا تو نام

بندھن

مجھ میں، اب میں نظر آتا نہیں تجھ کو، اور تو
دل میں یہ سوچتی رہتی ہے، کہ اِک دن شاید
میری ہستی، مجھے تو نے ہی ودیعت کی تھی

تجھ میں، اب تو نظر آتی نہیں مجھ کو، اور میں
دل میں یہ سوچتا رہتا ہوں، کہ میں نے شاید
تیرے سائے سے نہیں، تجھ سے محبّت کی تھی

پھر یہ بے کار سی اک قیدِ رفاقت کیا ہے
تجھے میری تو مجھے تیری ضرورت کیا ہے

قطعات

رُکنے لگتے ہیں خود بخود ہی قدم
ساتھ ساتھ ان کے جب نگاہ چلے
شہر کے خوش جمال، محوِ خرام
انھیں دیکھے کوئی کہ راہ چلے

داد، احساسِ نارسائی کی
ہم نظر باز، یوں بھی دیتے ہیں
دُور کے دل رُبا نظاروں کو
آنکھوں آنکھوں میں چوم لیتے ہیں

پھرتے رہتے ہیں ہم جو آوارہ
چاندنی رات کے نظاروں میں
دل کی تاریکیاں سموتے ہیں
جگمگاتے ہوئے ستاروں میں

دوڑتے بھاگتے ہوئے سائے
چلتی پھرتی یہ مورتیں دُھندلی
قسمتیں راستوں کی روشن ہیں
راہگیروں کی صورتیں دُھندلی

❖○❖

جو ہمیں آئینہ دِکھاتا تھا
رکھ دیا سامنے وہ جام اس نے
طور اپنا لیے ہمارے سب
لے لیا اپنا انتقام اس نے

❖○❖

ہر چند، کہ چارہ گر بضد ہوں
اب چاکِ جگر کے کیا سئیں گے
جیسے بھی ہم آج تک جیے ہیں
جینا ہے تو بس یونہی جئیں گے

❖○❖

❖○❖

میری پروردۂ سکوت صدا
سرمدی زمزمے سناتی ہے
جب میں خلوت میں گنگناتا ہوں
بزمِ آفاق جھوم جاتی ہے

❖○❖

ہر کرن کیفِ خود نمائی میں
اپسراؤں کا رُوپ بھرتی ہے
جب میں لہرا کے جام اٹھاتا ہوں
چاندنی رات رقص کرتی ہے

❖○❖

یہیں آکر رُکے گا سوچتا ذہن
کہ شاید مر گئے ہیں بے جیے ہم
حسابِ عمر اگر اس طور پر ہو
خود اپنے واسطے کتنے جیے ہم

کوئی چہرہ نہیں ایسا بھرم جس کا نہ ٹوٹا ہو
کوئی صورت نہیں ایسی جو پہچانی نہیں جاتی
لباسِ رنگ و بو پہنے، کہ تاجِ آتش و آہن
مگر تہذیبِ عصرِ نو کی عریانی نہیں جاتی

❖○❖

تمام عمر رہے تجھ سے دُور دُور تو کیا
ترے قریب بھی اک بار ہوگئے تھے ہم
تمام رات گزاری ہے جاگ کر لیکن
خوشا وہ وقت کہ کچھ دیر سوگئے تھے ہم

❖○❖

ان کی اِک اِک ادا کے سو سو لطف
ہر نفس میں ہمیں نصیب ہوئے
جا بسے جو نظر سے دُور کہیں
دِل کے کیوں اس قدر قریب ہوئے

❖○❖